جلد02 شمارہ۱۸، ۲۰۲۴

Article

A Thematic Study of Urdu Short Fiction: In the Perspective of Prisoner Characters

اُردو افسانے کا موضوعاتی مطالعہ: اسیر کرداروں کے تناظر میں

Aqsa Shafique[1*], Dr. Mohammad Awais Saleemi[2]

[1]Reserch Scholar, Department of Urdu, Govt. College Univeristy, Faisalabad.

[2]Assistant Controller Examination, , Govt. College Univeristy, Faisalabad.

*Correspondence: aqsashafique98@yahoo.com

اقصیٰ شفیق[1]، ڈاکٹر محمد اویس سلیمی[2]

[1] ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، [2] اسسٹنٹ کنٹرولر امتحانات، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract: 'Prison' is one of the most important themes in the Urdu literature. Many of the writers has selected 'Prison' as the subject of their fictions; and portrayed numerous captive characters. In the thematic study of the Udru fiction under consideration, the subjects related to imprisonment have been included, especially those associated with 'prison' and 'captive characters'. The current article disclosed how a common character has been caught into prison by facing such tough circumstances and finally became a prisoner. After being a prisoner, how much he struggles by facing the problems of prison.

Keywords: Captive character; Terrorism; Social factors; Cruelty; Human rights; psychological character; Prisoner of war; Necrophilia; Fear of prison.

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:19-۰7-2024
Accepted:17-۰9-2024
Online:27-۰9-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

اردو افسانے میں تخلیق کیے گئے قیدی کرداروں کے پس منظر میں افسانہ نگاروں کے رجحانات دیکھے جائیں تو بہت سے ایسے سماجی مسائل کی تصویر واضح نظر آتی ہے جو انسانی صورتِ حال کے دکھوں کی عکاس ہے۔ مجبور انسانوں کو آغاز ہی سے مقتدر طبقات قید و بند کی صعوبتیں دیتے رہے اور انسان اپنے کردہ یا ناکردہ جرائم کی سزا بھگتتے رہتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کوئی افسانہ نگار جب کسی افسانے میں کسی قیدی کا کوئی کردار تراشتا ہے تو اس کے پیچھے اصل میں ایک بہت بڑے موضوع کو بیان کرنا چاہ رہا ہوتا ہے۔

زندگی کشادہ فضا میں سانس لینے کا نام ہے۔ اگر انسان آزاد یا اپنے معاملات میں خود مختار نہیں اور کسی کے حکم کا پابند ہے تو وہ قیدی ہے۔ قید صرف یہ ہی نہیں کہ کسی جرم میں یا کسی جرم کے الزام میں جیل میں قید ہوا جائے بلکہ قید تو غلامی کا نام ہے۔ انسان آزاد ہوتے ہوئے بھی اگر غلامی کی سی زندگی بسر کر رہا ہو تو وہ ذہنی طور پر قیدی ہو جاتا ہے۔ اسے بہت سے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے مسائل کا شکار ہے تو وہ قید ہے۔ قید کا سلسلہ صدیوں کو محیط ہے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے بہت بڑے بڑے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ان مسائل کا شکار ہو کر قید ہو جانے والے لوگوں کے کرداروں کو بیان کیا ہے۔ سماجی ناانصافی، دہشت گردی، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، بھوک و افلاس، جنگ، نفسیاتی مرض یہ وہ بڑے بڑے مسائل ہیں جن کو افسانہ نگاروں نے موضوع بنا کر ان کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

اُردو افسانے میں اسیر کرداروں کے حوالے سے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ایک حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔ ان میں سماجی موضوعات بھی ہیں اور فرد کے داخلی اور نفسیاتی بھی۔ ان موضوعات کو اگر جامعیت کے ساتھ دیکھا جائے تو درج ذیل پہلو نمایاں ہیں:

دہشت گردی

دہشت گردی کا مطالعہ بہت سے علوم کا موضوع ہے۔ دہشت گردی کے ساتھ ساتھ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینا، عسکری پسندی، فرقہ وارانہ تشدد اور اقلیتوں کے خلاف تشدد ایک ہی نظریاتی فکر کے مختلف پہلو ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے افراد موجود ہیں۔ جنھوں نے دہشت گردی پھیلا رکھی ہے، سرِعام قتل ہو رہا ہے۔ عورتوں کی عزت کو پیروں تلے روندا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے غصے اور رعب کی بنا پر دوسروں کا ناحق قتل کر دیتے ہیں۔ تشدد کی بہت سے مثالیں عام دیکھنے کو ملتی ہیں۔ قتل و غارت کے پیچھے کوئی بڑی وجہ نہیں ہوتی۔ بس معمولی سی وجہ کی بنا پر نوجوان نسل غصے اور جذبات میں آ کر ناحق قتل کر دیتی ہے۔ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینا اُن کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ اسی لیے معاشرے میں دہشت اور خوف چھایا ہوا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے بھی دہشت گردی کو اپنے افسانوں کو موضوع بنایا ہے اور اس پر بہت سے افسانے لکھے ہیں۔

تبر، جواری، انتظار، سایہ، گناہ، حسن اخلاق، پھندا، انصاف، ان افسانوں میں افسانہ نگاروں نے دہشت گردی کو خاص موضوع بنایا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''تبر'' میں سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں نے ایک ہی وار میں اللہ دین کے نرخرے کو کاٹ دیا مجھے ایسا لگا کہ وہ چیخے گا اس کی چیخ نے اس کے سینے کو پھیلایا مگر وہ منہ سے کیسے نکلتی۔ میں نے دوسرے وار سے اس کی گردن کاٹ دی تھی اور اس کا سر لڑھک کر ٹخ سے نیچے گر گیا تھا۔۔۔ جب دلیر بول رہا تو شہباز کو ایسا لگا جیسے وہ سارے گاؤں کے سامنے اس پر جوتے برسا رہا ہے۔ اس نے پگڑی کو سر پر جمانے کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو ہتھکڑیاں جیسے اس پر ہنس پڑیں اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایسی بے عزتی برداشت کرنے سے تو قتل کا اقبال کر لینا بہتر ہے۔"[۱]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اس افسانے میں دہشت گردی کے موضوع کو بیان کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر چھپی وحشت اور غصے کو بھی سامنے لے کر آیا ہے، جو کہ دہشت گردی کا سبب بنتا ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار شہباز جس نے ایک معمولی سی وجہ پر یعنی بہت نڈر ہو کر ایک شخص کو قتل کر دیا اور جب پولیس نے اسے شاملِ تفتیش کر لیا اور شک کی بنا پر ہتھکڑیاں پہنا دیں تو اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہتھکڑیوں سے نہیں ڈر رہا تھا بلکہ اپنی توہین محسوس کر رہا تھا اور یہ دہشت گردی کی سب سے بڑی وجہ ہے کہ لوگ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قانون کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ دہشت گردی صرف یہاں تک ہی ختم نہیں ہوتی کہ قتل کر دینا یا کسی کو زخمی کر دینا بلکہ لوگ شریف، ایماندار، وفادار اور غریب لوگوں کے حق پامال کرتے ہیں۔ انھیں جان بوجھ کر ستاتے ہیں ان کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انھیں کسی ایسے جرم میں گرفتار کروا دیتے ہیں جسے کرنا تو دور کی بات جس کا انہوں نے سوچا ہی نہیں ہوتا غریب بے چارہ اس طرح دہشت گردی کا شکار ہو کر زندگی گزارتا ہے یا پھر جیل کی سلاخوں میں قید ہو جاتا ہے۔

افسانہ "گناہ" بھی اسی موضوع کی عکاسی کر رہا ہے۔ اس میں بھی افسانہ نگار نے اس موضوع کو بیان کیا ہے اور ایسے کردار بلکہ قیدی کردار کی عکاسی کی ہے جو دہشت گردی کی نذر ہو گیا اور بلاوجہ کر سزا بھگتنے پر مجبور ہو گیا۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ سوچنے لگا کہ اس معاشرے کو کیا ہو گیا ہے سماج کس سمت جا رہا ہے کہ ایک اور شخص اپنی بیمار موٹر سائیکل لے کر آ گیا۔۔۔ وہ بھاری بھر کم شخص آتے ہی دھاڑا "ابے لڑکے پہلے میری موٹر سائیکل ٹھیک کرو۔ مجھے جلدی ہے۔"

راجو منمنایا "صاحب میں تو ابھی ان کا اسکوٹر بنا رہا ہوں۔"

"پہلے اسے ٹھیک کر لوں تب آپ کی گاڑی میں ہاتھ لگاؤں گا۔"

وہ پھر دہاڑا "یہ سب نہیں چلے گا مجھے انتظار کرنے کی عادت نہیں اسے جلدی ٹھیک کرو۔۔۔" جاوید نے احتجاج کیا میں پہلے سے اپنا اسکوٹر بنوا رہا ہوں مجھے بھی جلدی ہے ہر شخص

کو جلدی ہے۔ آپ کو بھی ہو گی۔۔۔اس نے درمیان سے بات کاٹ دی۔ "یہ پہلے پیچھے کیا
ہو تا ہے۔"میں نہیں جانتا۔شاید تم مجھے پہچانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔"[۲]

دہشت گردی کا آغاز تو انسان کے اپنے گھر سے ہی شروع ہو کر معاشرے تک جاتا ہے اور پھر پورے ملک میں پھیل جاتا ہے۔ جائیداد دولت کی ہوس نے انسان کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ وہ اپنے عزیز رشتے داروں کی پہچان بھول چکا ہے۔ صرف اسی ایک چیز کی بنا پر انسان قتل کر دیتا ہے کہ قتل تو لوگوں کے نزدیک ایک ایسا کھیل بن چکا ہے جسے معاشرے میں موجود ہر تیسرا بندہ کھیل رہا ہے۔ غصہ آیا تو بات قتل وغارت تک پہنچ گئی۔ دولت کی ہوس دل میں پیدا ہوئی تو پلک جھپکتے ہی قتل کر دیا۔ رشتوں کی قدر، عزت، پیار محبت، احساس نرمی اب یہ کچھ بھی معنی نہیں رکھتا لوگوں کے نزدیک بس ہر کوئی ہر کسی سے آگے بڑھنے کی دھن میں دوسروں کو کچلتا چلا جارہا ہے۔

بشیر احمد طاہر کے افسانے "انصاف" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"شیرا بیل بنڈی اور کچھ سامان لے کر غریب نگر کے کھیڑے کو چلا گیا جہاں اس کا دوست موہن رہتا تھا اس کے دل میں غصے کی آگ سلگ رہی تھی اور وہ جمنا سے انتقام لینے کی سوچ رہا تھا۔"[۳]

اس طرح کی دہشت گردی نے معاشرے میں دہشت وبدامنی پھیلا رکھی ہے جس کا شکار سارا معاشرہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دہشت گرد اور تخریب کار گروہ بھی موجود ہیں جو اپنی تخریب کار سرگرمیوں کو مذہب کے ساتھ جوڑتے ہوئے لوگوں کو نقصان پہنچارہے ہیں۔ عورتوں کے حقوق پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ عورت تعلیم حاصل نہیں کر سکتی اس طرح کے اور بہت سے حربے استعمال کر کے تخریب کار گروہ لوگوں کو نقصان پہنچارہے ہیں۔ وہ لوگوں کو اسلام کے نام پر ورغلاتے ہیں اور ان کی ایسی ذہنی تربیت کرتے ہیں کہ ان کے اندر انتہاپسندی حد درجے کی پیدا ہو جاتی ہے، پھر اسے ٹارگٹ بنا کر لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔

منشایاد کے افسانے "پھندا" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"شاید اسے تین بار موت کی سزا پر ہنسی آئی ہو کہ ایک بار کی پھانسی کے بعد دوسری اور تیسری مرتبہ پھانسی کیسے دی جاسکتی ہے مگر وہ ایسا نامعقول شخص نہ دکھائی دیتا تھا کہ جرم کی سنگینی ظاہر کرنے والے فیصلے پر ہنس سکتا ہو۔ مگر پھر پہرے داروں کی معیت میں مجرموں کے کٹہرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے اسے یہ کہتے سنا۔ "خدایا تیرا شکر ہے تو نے مجھے سرخرو کیا اور شہادت کے لیے چنا۔"[۴]

دہشت گرد گروہ معصوم لوگوں کو پکڑ کر اُن کی ایسی ذہنی تربیت کرتے ہیں کہ وہ یہ ہی سمجھتے کہ وہ یہ سب کچھ اسلام کے لیے کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سب سراسر غلط ہو تا ہے۔ تخریب کار گروہ اپنی تخریب کار سرگرمیوں سے لوگوں کو نقصان پہنچارہے ہیں۔

انسانی حقوق

انسانی حقوق آزادی اور حقوق کو وہ نظریہ ہے جس کے تمام انسان یکساں طور پر حق دار ہیں۔ اس نظریہ میں وہ تمام اجزا شامل ہیں، جس کے تحت کرۂ ارض پر بسنے والے عام انسان یکساں طور پر بنیادی ضروریات اور سہولیات کے لحاظ سے حقوق کے حق دار ہیں۔ حقوق کے حصول کے لیے کسی بھی خطے یا معاشرے میں انسانی اخلاقیات، انصاف، روایات اور قدرتی طور پر سماجی عوامل کا مضبوط اور مستحکم ہونا ضروری ہے۔ حقوق ہر انسان کے ہوتے ہیں ہر ایک کی عزت ہوتی ہے۔ بحیثیت انسان ہر ایک کے حقوق ہیں۔ ان کے حقوق کو پامال کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا لیکن اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہ کسی کتاب میں نہیں لکھا کہ حقوق صرف امیروں کے ہوتے ہیں۔ بلکہ غریب بھی اسی معاشرے کا حصہ ہے۔ مظلوم بے سہارا، لاچار ہر کوئی اسی معاشرے کا حصہ ہے۔ ان کے بھی حقوق ہیں اور ان کے حقوق کو پامال کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔

بہت سے افسانہ نگاروں نے انسانی حقوق کو اپنے افسانوں کو موضوع بنایا ہے اور ایسے بہت سے افسانے لکھے ہیں جن میں انہوں نے ایسے قیدی کرداروں کی عکاسی کی ہے۔ جن پر بے تحاشہ ظلم و ستم کیا گیا ہے۔ ان کی عزتوں کو پیروں تلے روندا جارہا ہے۔ انھیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ قیدی مجرم ہو یا ملزم لیکن بحیثیت انسان اُس کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کسی افسر کو کسی بھی شخص کو چاہے وہ کسی بھی عہدے پر فائز ہو اسے کسی ملزم یا کسی مجرم قیدی کے حقوق کو پامال کرنے کا حق نہیں پہنچتا، اگر عدالت کسی بھی قیدی کو چار بار پھانسی کی سزا سناتی ہے تو اسے چار بار پھانسی پر چڑھا دو۔ اسے عمر قید کی سزا دے دو۔ لیکن اس کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کرنا اپنے عہدے کے غرور میں اسے ظلم و ستم کا نشانہ بنانا اُس کی عزت کی دھجیاں اُڑانا یہ اختیار کسی کے پاس نہیں۔

افسانہ نگاروں نے انسانی حقوق کے موضوع پر بہت سے افسانے لکھے اور اُن مظلوم قیدیوں کے کردار کو واضح کیا ہے۔ جن کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا جارہا ہے۔ اس حوالے سے رشید امجد کا افسانہ ''خزاں گزیدہ'' امراؤ طارق کا افسانہ ''پھانسی دینے والے ہاتھ'' اور خالدہ حسین کا افسانہ ''ابنِ آدم'' بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار نے قیدیوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو دکھایا ہے کہ کس طرح اُن کی عزت کے ساتھ کھیلا جارہا ہے۔ اُن کو جانوروں کی طرح ہانکا جارہا ہے۔ گالی گلوچ مار پیٹ کی جاتی ہے۔ افسانہ ''ابن آدم'' میں جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور جس طرح قیدیوں پر ظلم و ستم کیا جارہا ہے، کی افسانہ نگار نے واضح تصویر کشی کی ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ناقابلِ یقین! بھاری بوٹوں اور اسلحہ میں دبے نیلی کنجی آنکھوں اور سنگین ہونٹوں والوں نے اپنی گالیوں کا پورا ذخیرہ اگل دیا۔ ابو حمزہ کی پسلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے سینے پر نیل تھے اور کچے سرخ زخم اور اس کی ٹانگوں پر زخموں سے کیڑے سرسراہتے تھے اور اس کے خوبصورت جبڑے پر جگہ جگہ نیلے روبڑے ابھرے تھے اور اس کے بال الجھی ہوئی پٹ

سن کی صورت میں اس کی آنکھوں پر پڑے تھے۔۔۔اس کی انگلیاں شکر قندی کی طرح پھولی ہوئی تھیں اور ان سے پانی رستا تھا۔"[۵]

رشید امجد کے افسانے "خزاں گزیدہ" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"قیدی کو اس حالت میں لایا گیا کہ گلے میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں، زنجیروں کی چبھن سے پاؤں جگہ جگہ سے زخمی ہو گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ طوق کے دباؤ سے گردن کے گرد سرخ حلقہ بن گیا تھا جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ قیدی طوق کے بوجھ اور پاؤں کی زنجیروں کی وجہ سے سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔"[۶]

امراؤ طارق کے افسانے "پھانسی دینے والے ہاتھ" میں بھی مجرم قیدی کو پھانسی دینے کے بعد پولیس والے جب اس کی لاش لواحقین کے حوالے کرتے ہیں تو اس کے لیے انتہائی ناگزیدہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کی لاش کو کتے کی لاش سے تشبیہ دیتے ہیں جو کہ سراسر غلط ہے۔ کسی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ محض اپنے عہدے کے غرور میں۔ غصے میں یا دشمنی میں کسی کے لیے یا کسی کی لاش کے لیے ناگزیدہ الفاظ کا استعمال کرے، کیونکہ ہر انسان کے بحیثیت انسان بہت حقوق ہے جن کا وہ حق دار ہے۔ افسانے سے اقتباس درج ذیل ہے:

"میں ایک عورت ہوں۔ یہ میرے باپ کی لاش ہے میں تنہا اتنی اونچی چڑھائی پر لاش کو کس طرح لے جاسکتی ہوں۔"

"اسٹریچر گھسیٹ کر۔ اتنی شکتی تمہارے اندر اب بھی ہو گی۔"

"لاشوں کو گھسیٹ کر نہیں لے جاتے، تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم ہے۔"

"لے جاتے ہیں، آج تم اس لاش کو اسٹریچر پر ڈال کر گھسیٹ کر ہی لے جاسکو گی جس طرح کتوں کی لاش کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔۔۔جب تم اسٹریچر کو گھسیٹو گی تو دراصل لاش ہی گھسیٹو گی۔"[۷]

انسانی حقوق میں شامل عورت کے بھی بہت سے حقوق ہیں، معاشرے میں جہاں مرد کا مقام ہے وہاں عورت کا بھی اتنا ہی مقام و مرتبہ ہے۔ کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عورتوں کے حقوق کی خلاف ورزی کرے یا اُن کی عزت کے ساتھ کھیلے۔

نیلم احمد بشیر نے اپنے افسانے "ایک اور دریا" میں انسانی حقوق کو موضوع بنایا ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح سماج انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت کی عزت کو پیروں تلے روندتا ہے۔ عورت بھی قید ہو سکتی ہے قانون اس بات کا پابند ہے کہ مجرم کو پھانسی دے اور وہ مجرم کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت لیکن عورت کی عزت کے ساتھ کھیلنے کا حق کسی کے پاس نہیں کیونکہ اس معاشرے میں عورت کے بھی اتنے ہی حقوق ہیں۔ جتنے مرد کے اور یہ بات سماج کے لیے سمجھنی بہت ضروری ہے۔

نیلم احمد بشیر نے اپنے افسانے ''ایک اور دریا'' میں قیدی عورت کے کردار کی عکاسی کی ہے اور اس کے پیچھے انہوں نے انسانی حقوق کو موضوع بنا کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو وہ مقام نہیں دیا جاتا جو اُس کا اِس معاشرے میں ہونا چاہیے۔ ہر قصور کی ذمہ دار عورت کو ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ افسانے سے اقتباس درج ذیل ہے:

''ایک روز کچھ عجیب ہوا۔ سکینہ سوتے سوتے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کوئی اس کے علاوہ بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ غلام محمد! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟۔۔۔ تسلی رکھ سکینہ بی بی! او میں تو تیرا ہمدرد، تیرا اپنا ہوں ''اچھا!'' سکینہ نے فوراً ہی یقین کر لیا۔ شکریہ، بھائی غلام محمد! تو تو میرا اپنا ہی ہے نا۔۔۔ ''اچھا بھائی! تیری مہربانی۔''

''اچھا ایک بات سن ذرا۔۔۔ ادھر کو آنا میرے پاس۔'' غلام محمد نے اپنے دونوں بازو کھول دیے اور عجیب عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

سکینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہاں غلام محمد نہیں بلکہ ایک بدصورت تھوتھنی والا کتا ہانپتا ہوا رال ٹپکا رہا تھا، ہمدرد دوست کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ سکینہ جھجک کر پیچھے ہٹی اور چیخنے کی کوشش کی مگر غلام محمد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا کتے کے مضبوط، طاقتور، بپھرے ہوئے وجود کے آگے اس کی اپنی ہستی بے معنی ہو گئی۔ کتے نے اپنے شکار کو بھنبھوڑا، جھنجھوڑا اور پھر ریزہ ریزہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔''[۸]

سماجی ناانصافی

بے گناہ، لاچار، مصیبت زدہ، تنہا اور غریبوں کو ہی مصیبتوں کی چکی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے خاص طور پر غریبوں کے یتیموں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا، مظلوموں، بے سہاروں، لاوارثوں کے ساتھ برا سلوک کرنا، عورتوں کو اُن کا حق نہ دینا، یہ سب وہ ظلم و ستم اور سماجی ناانصافیاں ہیں جن کو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور ان موضوع کو بنیاد بنا کر انہوں نے قیدیوں سے متعلق افسانے لکھے ہیں۔ ''واپسی''، ''اپنا اپنا انصاف''، ''قیدی''، ''توبہ ٹیک سنگھ''، ''بے گناہ''، ''کوئلہ بھئی نہ راکھ'' اور ''دادا'' ایسے افسانے ہیں جن میں افسانہ نگار نے سماجی ظلم و ستم، سماجی ناانصافیوں کو بیان کرتے ہوئے قیدی کرداروں کی عکاسی کی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانے ''بے گناہ'' میں ایک ایسے قیدی کردار کی عکاسی کی ہے جو معاشرے کے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کو شکار ہو گیا۔ غریب، لاچار، بے سہارا لوگ امیروں کے غصے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''صبح صبح چوپال پر سب گاؤں والے اکٹھے ہو گئے۔ عورتیں چھتوں پر کھڑی رو رہی تھیں۔۔۔

چوپال پر گاؤں والوں کی چہ مگوئیوں سے ایک عجیب سی دبی دبی سرسراہٹ کی آواز آتی تھی۔

رحمان کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی وہ سر جھکائے اپنی پھٹی ہوئی جوتی کو دیکھ رہا تھا۔ ذیلدار اپنا سب

سے اچھا لباس پہنے مسکرا رہا تھا سپاہی حقے کے کش لگا رہے تھے اتنے میں حوالدار اُٹھا اور بولا
''اچھا، رحموں، اُٹھو۔ کال کو ٹھڑی کی ہوا کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''[۹]

غلام عباس خان نے بھی اپنے افسانے ''انصاف اپنا اپنا'' میں سماجی ظلم و ستم کو بیان کیا ہے۔ غریب، ایماندار طبقہ سماجی ناانصافیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں نے اُس انسانی مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے۔ اُس حل کو قانون دان ڈاکہ کہتے ہیں۔ مکار، بدنیت، بدکار اور ظالم لوگوں سے انہی کے انداز میں نپٹنے کو کیا ڈاکہ کہتے ہیں؟۔۔۔ میں قطعاً ڈاکو نہیں میں ایک شریف شہری ہوں۔ میں نے یہ اقدام کر کے بلکہ معاشرے کی بہتری چاہنے والوں کو معاشرے کی پریشانیاں دور کرنے کی راہ دکھائی ہے۔''[۱۰]

لوگ ایمانداری کے ساتھ جینا بھی چاہیں تو یہ سماج انھیں جینے نہیں دیتا، مکار، بدنیت، رشوت پسند لوگ اس سماج میں بستے ہیں اور وہ اصول پرست، ایماندار لوگوں کو سکون کی زندگی نہیں گزارنے دیتے ہر مظلوم شخص ظالم سماج کا شکار ہو چکا ہے۔ لوگ بہت بڑے قدم صرف اسی وجہ سے بھی اُٹھا لیتے ہیں کہ سماج کیا کہے گا؟ لوگ کیا کہیں گے؟ ہماری کوئی عزت نہیں رہ جائے گی۔ لیکن یہ ظالم معاشرہ پھر بھی ایک شریف اور معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والے شخص کو جینے نہیں دیتا۔

سماجی حالات انسان کو غلط قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ نوجواں نسل جذباتی ہو جاتی ہے۔ جذباتیت میں آکر وہ غلط صحیح کی پہچان بھول جاتی ہے۔ انھیں صرف یہ فکر ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ دنیا کا سامنا کیسے کریں گے؟ اکثر دیکھا جاتا ہے لوگ جب انتہائی غلط قدم اٹھاتے ہیں تو ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ سماج کے طعنوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ دنیا کی باتیں برداشت نہیں ہو سکتی تھیں۔ اپنی عزت نہیں گنوا سکتے تھے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے سماجی حالات کی زد کا شکار ہو کر قتل کر دینے والے مجرموں کے کرداروں کو واضح کیا ہے۔

مسعود مفتی نے اپنے دو افسانوں ''انصاف'' اور ''واپسی'' میں سماجی حالات کو خاص موضوع بنایا ہے اور اس سماجی حالات کی زد کا شکار ہو کر قتل کر دینے والے مجرم قیدی کرداروں کی عکاسی کی ہے۔

مسعود مفتی نے ''انصاف'' میں بھی سماجی ناانصافیوں کو سماجی طنز کو موضوع بناتے ہوئے ایک ایسے قیدی کا کردار واضح کیا ہے جس سے قتل سرزد ہو جاتا ہے، اور وہ قتل صرف اسی بنا پر کرتا ہے کہ سماج کیا کہے گا؟ لوگ اسے طنز کریں گے۔ سماج میں اس کی عزت ختم ہو جائے گی، تو یہ سماج ایماندار اور شریف لوگوں سے بہت بڑے بڑے کام کروا گزرتا ہے جو بعد میں سزا کا سبب بنتے ہیں۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اگلی صبح تک ملزم کو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی بیوی حاملہ ہے۔ اس کے احتجاج پر والدین اور چچا نے ساری بات سمجھائی مگر وہ سخت ناراضی کی حالت میں

بیوی کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا۔۔۔ چار ماہ بعد اسے اطلاع دی گئی کہ اس کی بیوی کے ہاں لڑکا ہوا ہے اس نے چھپانے کی کوشش کی مگر دفتر میں کسی کو اپنے رشتہ دار کی معرفت پتہ چلا اور بات ہر طرف پھیل گئی۔ اس سے اُٹھتے بیٹھتے مذاق ہونے لگا اور اس نے احساسِ کمتری میں سب لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا۔"[۱۱]

اسی افسانے سے ایک اور اقتباس درج ذیل ہے:

"ملزم بے قصور لگتا تھا وہ حالات کی زد میں آ گیا تھا۔ ایسے حالات جو اس کے اپنے پیدا کردہ نہ تھے۔ شادی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی۔ بیوی کی حالت کا اسے علم نہ تھا۔ اگر وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا تو دنیا اسے بے غیرت کہتی طعنے اس کے چاروں طرف گھومتے اور زمانے بھر میں نکو بن جاتا۔"[۱۲]

اِسی طرح افسانہ "واپسی" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"جیسے جیسے گاؤں قریب آتا گیا وہ سوچنے لگا کہ میں گاؤں میں داخل کیسے ہوں گا میں لوگوں کو سامنا کیسے کر سکوں گا۔ پہلے تو چنگی پر ہی دو چار خیر صلا پوچھنے والے ہوں گے۔ آگے اڈے پر سبھی دوکاندار اور خوانچے والے جانتے ہیں۔ اس سے آگے مسجد کے مولوی صاحب بچے پڑھانے کے ساتھ ساتھ باہر جھانکتے رہتے ہیں۔ جن سے بات کیے بغیر آگے نکلنا ممکن نہیں اور پھر اس کے بعد تو بازار ہے۔ جہاں سو ملنے والے ہوں گے۔ وہ ان سب کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کیسے کر سکے گا؟"[۱۳]

سماج کے طنزیہ جملے انسان کی زندگی کو انتہائی مشکل بنا دیتے ہیں اور سماجی حالات کا شکار ہو کر بہت سے لوگ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ افسانہ "واپسی" سے ایک اور اقتباس درج ذیل ہے:

"اسے دیکھ کر مجمع میں بھنبھناہٹ سی ہوئی۔ ایک آدھ طنزیہ آواز آئی۔ "لو پتر بھی آ گیا۔۔۔ "باپ کے چہرے سے اپنی پھٹی پھٹی نظریں ہٹا کر اس نے مجمع پر نگاہ دوڑائی۔ حیرانی۔۔۔ دلچسپی۔۔۔ تمسخر۔۔۔ طنز۔۔۔ احساسِ برتری۔۔۔ طعن۔۔۔ یہ سب اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔"[۱۴]

سعادت حسن منٹو کے افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں بھی جو پاگل قیدی کا کردار ہے وہ بھی ظالم سماج کی بھینٹ چڑھ گیا کہ اُس کا دماغ اُلٹ گیا اور وہ پاگل ہو گیا لوگوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ اُسے ہمیشہ کے لیے پاگل خانے چھوڑ گئے۔ جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید ہو کر رہ گیا۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے۔ وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ اُلٹ گیا اس کے رشتے دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔"[۱۵]

"کوئلہ بھئی نہ راکھ" اس افسانے میں بھی نگہت سلیم نے سماجی ناانصافیوں کو موضوع بنایا ہے اور اس میں ایک ایسے نفسیاتی کردار کی عکاسی کی ہے جو نفسیاتی مرض میں مبتلا نہیں تھا بلکہ سماج کی باتوں نے اُسے اس قدر نفسیاتی مریض بنا دیا کہ اس نے اپنی تین تین بیٹیوں کو ایک گھر میں قید کر کے اُن کی زندگی موت سے بھی بدتر کر دی۔

جہاں شریف، معزز، نیک لوگ ظالم سماج کا شکار ہیں۔ وہاں معزز، شریف، مجبور، بے سہارا اور مظلوم عورتیں بھی ظالم سماج کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ عورت بے قصور ہو کر بھی قصوروار ٹھہرا کر کٹہرے میں کھڑی کر دی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی ظالم سماج کا ہاتھ ہوتا ہے جو اسے سکون سے جینے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ خدیجہ مستور کے افسانے "دادا" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"اور پھر اسی دن اس کے شوہر اور ساس نے دودھ پیتے بچے کو اس کی گود سے چھین کر گھر سے نکال دیا۔ دوسرا شہر تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائے، کس کے پاس پناہ لے برقعہ میں الجھی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں اسے محلے کے تانگے والے کی بیوی مل گئی۔۔۔ تانگے والی نے زمین پر بیٹھ کر چرس بھری سگریٹ پی اور پھر اسے بھی زبردستی پوری سگریٹ پلا دی۔۔۔ دو تین دن کے بعد جب اس کے آنسو نہ تھمے تو تانگے والی نے اسے بتایا کہ اس کے آدمی کا ایک دوست اس پر عاشق ہو گیا ہے۔۔۔ دوسرے دن اس کا محبت کرنے والا اسے شہر کی بڑی تاریک اور پُراسرار گلیوں کے ایک مکان میں لے گیا۔ جہاں اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا ساتھی چوری کر کے پیٹ بھرتا ہے۔۔۔ ایک سال بعد اس نے اپنے آدمی سے ضد کی کہ اب وہ بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹائے گی اس اظہار سے وہ بہت خوش ہوا اور جلد ہی چوری کے موٹے موٹے گر بتا دیے۔"[۱۶]

ایک عورت جو کہ شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی لیکن لوگوں نے اُسے اتنا برا بنا دیا کہ وہ چور بن گئی اور چور سے قاتل بن گئی جسے عمر قید کی سزا ہو گئی اور اس طرح اُس کی ساری زندگی خراب ہو گئی۔

جنگی مسائل

جنگ بھی بہت بڑا موضوع ہے جسے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے اور اس موضوع پر بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ جنگ میں ہونے والے واقعات و حادثات کو انہوں نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔

افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو بیان کرتے ہوئے جنگی قیدیوں کے کردار کو بھی واضح کیا ہے۔

''مامتا''، ''سمجھوتا''، ''مردہ گھر'' اور ''قیدی'' یہ وہ بڑے افسانے ہیں جس میں جنگ کے موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے ان افسانوں میں جنگی قیدیوں کے کردار کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح انہوں نے ظلم و ستم برداشت کیا؟ اپنے گھر والوں سے دور رہے۔ اپنے اوپر ظلم سہتے رہے۔ ملک کے لیے لڑتے رہے۔ بے تحاشہ ظلم و ستم برداشت کرنے کے باوجود بھی اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ڈٹے رہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''مامتا'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ اس روز میں خوب خوب رویا مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع۔ یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں۔ جیسے جنگ نے میری بانہوں سے میری ماں کو کھسوٹ لیا ہے۔ جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مگر اب اس کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں۔''[۱۷]

جنگ کا سلسلہ تو صدیوں سے ہی چلا آ رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے قربانیاں دیں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ دشمنوں کی قید میں رہے۔ تکلیفیں برداشت کیں۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۷۱ء اور ۱۹۶۵ء کی دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ جس میں مسلمانوں نے بہت سی قربانیاں دیں جنگی قیدی بن کر رہے یہاں تک کہ اپنی جان تک قربان کر دی۔ بانو قدسیہ کے افسانے ''سمجھوتہ'' سے اقتباس درج ذیل ہے:

> ''ہم نے دشمن کی قید میں وطن کی محبت سیکھی۔ کمزور اور بے ہمت آدمی کے پاس دو سہارے ہوتے ہیں یا وہ روتا ہے یا بھاگ جاتا ہے۔ ہم کمزور تھے اور نہ رو سکتے تھے اور نہ ہی بھاگ سکتے تھے۔''[۱۸]

جنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو صدیوں سے چلتا آ رہا ہے۔ دشمن جب چاہتے تھے پاکستان پر حملہ کر دیتے تھے جس سے جنگ چھڑ جاتی اور ادھر کے لوگوں کر گرفتار کر کے جنگی قیدی بنا دیا جاتا۔ وہ ہر لحہ کوشش کرتے اور ملک کے لیے لڑتے رہتے اپنے اوپر ظلم برداشت کرتے لیکن ملک کی حفاظت اُن کے ذمے تھی اور وہ اپنے منہ سے ایک لفظ نہ نکالتے یہاں تک کہ اُن کی جانیں بھی چلی جاتیں۔

افسانہ نگاروں نے اس مسئلے کو اپنے افسانوں کا خاص موضوع بنایا ہے اور اس پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جنگی قیدیوں پر ہونے والے ظلم کو بھی بیان کیا ہے۔ شوکت صدیقی کے افسانے ''مردہ گھر'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پہرے پر کھڑے ہوئے فوجی سپاہی نے پہلے تو غصے سے عورت کو چیخ چیخ کر گالیاں دیں پھر قیدیوں کو ڈانٹنے لگا۔ مگر جب وہ ڈانٹنے ڈپٹنے پر بھی باز نہ آئے تو وہ اپنی سنگین سنبھال کر ان کی طرف جھپٹا قیدیوں نے خوف زدہ ہو کر باڑھ کو چھوڑ دیا۔''[۱۹]

اسی طرح جمیل عثمان کے افسانے ''قیدی'' سے اقتباس درج ذیل ہے:

''تھوری ہی دیر میں پانچ فوجی پریڈ کی شکل میں پیر پٹختے ہوئے آئے اور اس قیدی کے سیل میں داخل ہوئے جس نے پانی پھینکنے کی ابتدا کی تھی۔ چار نے مل کر اسے منہ کے بل فرش پر لٹایا اور پانچویں نے اس کے دونوں ہاتھ پلاسٹک کے فاسٹنر سے اس زور سے باندھے کے قیدی درد سے چیخ اُٹھا پھر دو فوجیوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔''[۲۰]

جنگ میں قید لوگوں نے بہت ظلم و ستم برداشت کیے، جب تک جنگ جاری رہتی جنگی قیدیوں پر اسی طرح ظلم و ستم ہوتا رہتا اور وہ دشمنوں کی قید میں ہی رہتے۔ باہر نکلنے کا اُن کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور اسی طرح وہ مصیبتوں، تکلیفوں کا سامنا کرتے رہتے۔ اُن کے حقوق کو پامال کیا جاتا۔ اُن کی عزت کو روندا جاتا۔ دشمن جنگی قیدیوں پر بہت ظلم کرتے انھیں مارتے پیٹتے یہاں تک کہ اُن کی جانیں بھی چلی جاتیں۔

مذہب کی غلط تعبیر

یہ بھی بہت اہم موضوع ہے بہت سے افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے اور ایسے کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ جو مذہب کی غلط تعبیر کرتے ہیں۔ شاید وہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ جو بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی یہ ہی سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام خود نہیں کیا بلکہ اُن کی قسمت میں ہی ایسا لکھا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے وہ ہمارے ساتھ ہو کر ہی رہے گا۔ اس لیے وہ جو کام کرتے چلے جاتے ہیں اُسے مذہب کے ساتھ تقدیر کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔

طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے ''کیس ہسٹری'' میں اس موضوع کو بیان کیا ہے اور ایک ایسے کردار کو واضح کیا ہے جو مذہب کی غلط تعبیر کرتا ہے وہ Necrophilia ہے۔ اس لیے وہ تین تین قتل کرنے کے جرم میں جیل میں قید ہے اور اسے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ اپنی کہانی کو تو وہ صحیح بیان کرتا ہے لیکن وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ اس نے اپنے نفس کی بھوک مٹانے کے لیے تین تین قتل کر دیے۔ وہ ہر دم یہی سوچتا ہے اور کہتا ہے یہ سب تقدیر کا لکھا ہوا تھا۔ یہ قدرت کا کھیل ہے اگر تقدیر میں نہ لکھا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ تقدیر میں لکھا جا چکا تھا کہ میرے ہاتھوں تین تین قتل ہونے ہیں اس لیے میرے ہی ہاتھوں تین تین قتل ہوئے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''تو تم اس وقت پچھتا رہے ہو۔۔۔''

''نہیں پچھتاوا کیسا تقدیر والا تیر پھینکا جا چکا تھا اور اسے اپنے نشانے پر لگنے کے لیے حالات کو تو ساز گار بننا ہی تھا۔''

''تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ ان تمام قتلوں کا محرک وہ ملاح تھا۔''

"۔۔۔ نہیں میں یہ نہیں کہہ رہا میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ قدرت کا کیا ہوا فیصلہ لاگو کرانے میں اس نے اپنے حصے کا کام کیا۔۔۔ بس اتنا سا۔۔۔ بس یہی کچھ۔۔۔ کل پرسوں جب میں اپنے پروردگار سے ملاقات کروں گا تو پوچھوں گا ضرور کہ ہونی کے واسطے میرا انتخاب ہی کیوں کیا گیا۔"[۲۱]

یعنی وہ شخص مذہب کی غلط تشریح کرتا ہے ایسے لوگ خود غلط کام کرتے ہیں لیکن اپنے کیے ہوئے جرم کو تقدیر کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں۔

نفسیاتی مسائل

خارجی حالات انسان کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں، ایسا ممکن ہے کہ انسان حالات کی زد کا شکار ہو کر نارمل سے ابنارمل ہو جائے۔ ابنارملٹی انسان کے اندر تب جنم لیتی ہے جب وہ کسی گہرے صدمے سے دوچار ہوا ہو اور جس کے اثرات نے اسے ہلا کے رکھ دیا ہو۔ اس سے انسان نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ وہ اپنی اصلی حالت کو کھو دیتا ہے۔ اس کے اندر سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

نفسیاتی مسئلہ بہت اہم مسئلہ ہے جس کا شکار ہو کر بہت سے افراد اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیتے ہیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت اُن کے اندر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہر وقت اُن یادوں کے ساتھ رہتے ہیں، جو اُن کے دل و دماغ پر نقش کر گئی ہیں۔ دُنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں بلکہ اُن کو اپنی ہوش تک نہیں رہتی۔ جسمانی طور پر تو ایسے افراد نارمل ہوتے ہیں لیکن ذہنی طور پر ابنارملٹی کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔ جنھیں ہم نفسیاتی یا ذہنی مریض کہتے ہیں۔ ایک نارمل فرد کا اچانک سے ابنارمل ہو جانا اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرکات چھپے ہوتے ہیں جن کا شکار ہو کر وہ ابنارمل ہو گیا۔ ان محرکات میں سے ایک محرک قید ہے جو بہت بڑا مسئلہ ہے۔ انسان آزاد ہوتے ہوئے بھی اگر کسی کے حکم کا غلام ہے تو وہ قید ہے۔ ایک فرد جسے قید ہو چکی ہے جو ہر وقت قید میں ہے بس چار دیواری کے اندر اُس نے اپنی زندگی گزارنی ہے، تو وہ زندگی کیسی زندگی ہو گی؟ اُس زندگی سے اُسے وحشت ہونے لگتی ہے۔ وہ ہر چیز سے محروم ہے بس اُس چار گز کی کوٹھڑی کے اندر اُسے رہنا ہے تو یہ خارجی حالات اُس کے ذہن پر اثر انداز ہوں گے جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریض بن جائے گا۔

اس مسئلے کو بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اور ایسے کرداروں کا ذِکر کیا ہے جو خارجی حالات کا شکار ہو کر نفسیاتی مریض بن گئے۔

خالدہ حسین نے بھی اپنے افسانے "آخری خواہش" میں نفسیاتی مسئلے کو موضوع بنایا ہے اور ایک ایسے قیدی کے کردار کو واضح کیا ہے جس پر جرم ثابت ہو چکا ہے اور اسے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے اب پھانسی لگنے سے پہلے جب اُس سے اُس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو

وہ گلاب جامن کی فرمائش کرتا ہے جس طرح وہ گلاب جامن کھاتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نارمل نہیں رہا ہے کوئی ایسا محرک اُس کے پیچھے ضرور تھا جس نے اُسے نارمل سے ابنارمل بنادیا۔ اسی افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مگر میں یہی دیکھتا رہا کہ وہ کس طرح گلاب جامنوں پر ٹوٹ پڑا اس کی حریص اُنگلیاں دو دو گلاب جامنوں کا ایک نوالہ بناتی چلی گئیں پھر اس نے اپنی اُنگلیاں چاٹیں ''اتنی ہی اور'' اس نے خالص حرص کی آنکھوں کے ساتھ کہا اور ہتھیلیاں تک چاٹ گیا۔''[۲۲]

ہوسِ دُنیا

لالچ، حرص اور ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اکثر مشاہدہ میں آیا ہے بہت سے افراد اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لیے انتہائی خطرناک قدم اُٹھالیتے ہیں اور اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ مال و دولت کی ہوس بھی انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اُس کے نزدیک سب کچھ مال و دولت ہی ہوتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دولت کے سامنے تو انسان کی جان کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی کیونکہ دولت کے پجاری انسانیت کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ اُن کی خود غرضی اِنتہا درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں کسی دوسرے انسان کی زندگی اُن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہاں تک کہ لوگ قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ یہ تک نہیں سوچتے کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ اس طرح کے بہت سے واقعات رُونما ہو رہے ہیں کہ لوگ مال و دولت کی ہوس میں اپنوں کو ہی مار ڈالتے ہیں۔ وہ کیونکہ دولت کے لالچ نے انھیں اندھا کر دیا ہوتا ہے۔ ہوسِ دولت بھی ایک ایسا موضوع جس پر بہت سے افسانہ نگاروں نے قلم اُٹھایا ہے۔

انور خواجہ کا افسانہ ''سفید پتھر'' اس موضوع کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک ایسے فرد کا کردار واضح کیا ہے جو صرف اور صرف دولت سے پیار کرتا ہے اور دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے اسے سگے رشتوں کی کوئی پہچان نہیں ہے وہ سب کو بھول چکا ہے۔ اس لیے وہ اپنی خالہ زاد بہن سے دولت چھیننے کے لیے اُسے اور اُس کے شوہر کو مارنے کا اِرادہ کرلیتا ہے یہ سوچے بغیر کہ اس کا انجام کیا ہو گا اور یہ کارنامہ سرانجام دینے کے لیے وہ ساری تیاریاں کرلیتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت قتل دو لوگوں کا نہیں بلکہ ایک کا ہوتا ہے اس کی کزن کی جان بچ جاتی ہے اور اُس کا شوہر مر جاتا ہے۔ پولیس تفتیش کرنے کے بعد سارے ثبوت اکٹھے کرنے کے بعد بالآخر اصل قاتل تک پہنچ کر اسے گرفتار کرتے ہوئے جیل میں قید کر دیتی ہے۔ اسی افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''انسپکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔۔۔ راشد کو آپ سے نہیں، آپ کی جائیداد سے محبت ہے اب چونکہ اس نے چالاکی سے آپ کے شوہر کو راستے سے ہٹادیا، قتل کو ایک حادثہ کا رُوپ دینے کی کوشش کی۔''[۲۳]

بہت سے دُنیا کی دولت کے پجاری دولت کی ہوس میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے بڑے سے بڑا جرم کر گزرتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا انجام خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ دولت کی ہوس نے انھیں اس قدر اندھا کر دیا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے دوسروں کی زندگی بھی ختم کر دیتے ہیں اور اپنی زندگی بھی خراب کر لیتے ہیں۔

پیراسائیکالوجی

نفسیات کی ایک شاخ پیراسائیکالوجی (مابعد نفسیات) ہے۔ پیراسائیکالوجی ایسے علوم کا مجموعہ ہے جن کا تعلق ایسے تجربات و مشاہدات سے ہے جنھیں حواسِ خمسہ تمام حالات میں محسوس نہیں کر سکتے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اکثر اوقات انسان مختلف خدشات کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ جو سوچتا ہے ویسا ہی حقیقت میں ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ڈر، خوف میں مبتلا رہتا ہے اور ویسا ہی سوچتا چلا جاتا ہے بلکہ اُسے ہر جگہ ویسا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

پیراسائیکالوجی بھی ایک اہم موضوع ہے، جس پر بہت سے افسانہ نگاروں نے قلم اُٹھایا ہے۔ بانو قدسیہ کا افسانہ ''اقبالِ جرم'' بھی اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس میں ایک ایسے قیدی کردار کا ذِکر کیا گیا ہے جو جرم کا اقبال اسی لیے کر لیتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے ہی اپنی محبوبہ کو قتل کیا ہے حالانکہ قتل اُس نے نہیں کیا ہوتا لیکن وہ اپنی ناکام محبت کی وجہ سے اُسے قتل کرنے کا سوچتا ہے وہ صرف غصے میں ایسا کہتا ہے اور سوچتا ہے، لیکن ایک دن اچانک اُس کی محبوبہ قتل ہو جاتی ہے تو وہ یہ دیکھ کر اپنے ذہنی اعصاب پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ اسے یہی لگتا ہے کہ یہ اُس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس لیے وہ عدالت میں بیان دیتا ہے کہ قتل اُس نے کیا ہے اُسے سزا دی جائے۔ اسی افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جب نذیر واپس آیا تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ موٹر سائیکل کو سٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے مجھے کہا تھا: بخدا! میں اس کو مزہ چکھا دوں گا۔۔۔ اس نے مجھ پر رفیق کو ترجیح دی ہے لیکن اسے رفیق تک پہنچنا نصیب نہ ہو گا۔''[۲۴]

اسی افسانے سے ایک اور طرح کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں آپ سے بھی کہتا ہوں اور کورٹ میں بھی میں نے فاضل جج سے یہی کہا تھا کہ نذیر نے عذرا کا قتل کیا ہوتا تو وہ اس کرب سے گھر والوں سے نہ پوچھتا کہ عذرا کو کب کسی نے قتل کر دیا؟۔۔۔ ہاں جس مصلحت کے پیشِ نظر اس نے اقبالِ جرم کیا تھا وہ کچھ اور تھی۔''[۲۵]

حسن منظر کا افسانہ ''ہوا بند کیوں ہے'' اس میں بھی جو قیدی کردار ہے۔ اُس پر جرم ثابت ہو چکا ہے اور اسے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ پھانسی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی اور اُسے جیل میں قید رکھا ہوا تھا۔ جیل میں سپاہی اُسے ایک ایسے قیدی کی کہانی سناتا ہے جو اس تاریک کوٹھڑی سے ڈرتا تھا اور ڈر کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی اب اُس قیدی کو بھی ڈر لگنے لگا ہر لمحہ اُسے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ہے جو اسے نظر نہیں آتا وہ بار بار اُٹھ جاتا اُسے اس کوٹھڑی میں اندھیرا اور زیادہ لگنے لگا یہاں تک کہ گھٹن محسوس ہونے لگی،

کیونکہ وہ اس بارے میں ہمیشہ سوچتا رہتا جو کہانی اسے سنائی گئی تھی۔ پھانسی کی سزا کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کیونکہ اُس کے سامنے پھانسی کبھی کسی کو نہیں دی گئی۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے پھانسی کا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ اس خوف کے بارے میں کچھ نہیں سوچتا تھا۔ وہ یہی سوچتا تھا کہ اس اندھیری کوٹھڑی میں جنات کا سایہ ہے اور یہ محض اُس کا وہم تھا اس خوف کی وجہ سے بالآخر اس کی موت واقع ہو گئی، بالکل ویسے ہی جیسے پہلے قیدی کی ہوئی تھی، یعنی جو اِس نے سوچا وہ حقیقت میں ہو گیا۔ اسی سلسلے میں افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس نے ڈرتے ڈرتے گردن لمبی کر کے سلاخوں میں سے باہر جھانکا اور دوبارہ گڑمڑی مار کر بیٹھ گیا اس گھپ اندھیرے میں وحشت تھی۔ اندھیرا نہ قتل کی واردات دوبارہ سنا رہا تھا، نہ پھانسی پانے کے خوف کو اس پر مسلط کر پایا تھا ویسے بھی پھانسی پانے کا جسمانی خوف فی الحال بے معنی تھا، کیوں کہ اس نے کبھی کسی کو پھانسی چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ کہیں ایک اُلّو اپنی بھدی آواز میں دو تین بار چیخا احمد نے اپنے پورے جسم کو سن ہوتے ہوئے محسوس کیا یہی اندھیرے کا گم بودگی، بے کلی اور دہشت کا پیغام تھا۔''[۲۶]

اس حالت میں بھی انسان نارمل نہیں رہتا ہر لمحہ ہر چیز سے اسے خوف آنا شروع ہو جاتا ہے یعنی جیسا وہ سوچے اگر ایسا حقیقت میں ہو جائے تو وہ انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے اور پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے یہی لگتا کہ ویسا ہو رہا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو اس طرح کی حالت میں انسان ڈر، خوف میں مبتلا رہنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے ہر لمحے یہ خوف ہوتا ہے کہ وہ جو سوچے گا وہ ہو جائے گا، پھر اس کے خیالات مافوق الفطرت عناصر تک جا پہنچتے ہیں اور اُسے ویسا اپنے سامنے رُونما ہوتا ہوا نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان حالات میں انسانی نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔

جنسی موضوع

جنس ایک وسیع اور دقیق موضوع ہے۔ اس کی سرحدیں لامحدود ہیں۔ اس کی کارفرمانیاں زندگی کے ہر شعبے میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ''جنس'' کو آج تک وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو اس کا حق تھا۔ اسے وہ اہمیت نہ مِل سکی جو ملنی چاہیے تھی۔ یہ ایک صحت مند موضوع ہے، لیکن کچھ لوگ اس لفظ کا گھٹیا سا مطلب نکالتے ہیں۔ وہ خود بھی گھٹے ہوئے ماحول کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ جو ''جنس'' کا واضح اور صحت مند تصور نہیں رکھتے۔ جنس کا راز زندگی اور افزائشِ نسل کا راز ہے جسے صحت مند طریقے سے سمجھنے اور معلومات حاصل کرنے میں ہی ہماری فلاح و بہبود مضمر ہے، لیکن کچھ لوگ اس لفظ کا غلط مفہوم بناتے ہوئے غلط کاموں کی طرف قدم اُٹھا لیتے ہیں۔ اس موضوع کے حوالے سے بہت سے افسانہ نگاروں نے قلم اُٹھایا ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانے ''کیس ہسٹری'' میں بھی جنس کو موضوع بنایا گیا ہے بلکہ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک ایسے کردار کی عکاسی کی ہے جو جنس کا نہایت گھٹیا اور نیچ تصور ذہن میں لاتے ہوئے نہایت وحشیانہ حرکت کرتا ہے وہ اپنی جنسی ہوس پوری کرنے کے

لیے ایک دو نہیں بلکہ تین تین قتل کر دیتا ہے اور پھر تین قتل کرنے کے بعد بھی مردہ لاش کے ساتھ اپنی ہوس پوری کرتا ہے۔ افسانہ ''کیس ہسٹری'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی اس کے پیروں تلے دریا کنارے کی جنگلی ڈھب چڑمڑ ہو رہی تھی۔ پیر گیلی ریت میں دھنس رہے تھے سیاہ دھوتی کا پلّو ہوا میں اُڑ رہا تھا اور گھٹنوں تک پنڈلیاں ننگی ہو رہی تھیں۔ ''استغفر اللہ استغفر اللہ'' قیدی کے پورے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی ''اُف خدایا۔۔۔ وہ پنڈلیاں جیسے آسمانی بجلی کی دمکتی ہوئی دھاڑیں، ملگجے اندھیرے میں بھختی ہوئی مشعلیں، جیسے شراب کی بلوریں بوتلیں۔۔۔ پھر ان پنڈلیوں کے اُوپر رانیں اور پھر۔۔۔ کولہے اور ناف اور پھر۔۔۔ استغفر اللہ استغفر اللہ۔۔۔ میرے تصور میں اُس جسم کے شیش محل کا نقشہ آراستہ ہونے لگا۔''[۲۷]

اسی افسانے میں سے ایک اور طرح کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب میں نے سیاہ دھوتی میں چھپی اُن پنڈلیوں کو چھوا تاریکی نے اُن کی روشنی تو جذب کر لی تھی لیکن اُن کی مخروطی گھڑت میں سے شرارے اب بھی پھوٹتے تھے، جیسے کرنٹ چھوڑتی ٹیوب لائٹوں کو چُھو لیا ہو میں نے وہ جاگ گئی تھی حالات کو سمجھنے میں اُسے جو دو منٹ لگے تب تک ان پنڈلیوں سے چھٹتا یہ کرنٹ میرے پورے وجود کو بھسم کر چکا تھا میرے سر کو وہ چڑھ گئی تھی جو ٹھنڈی ہوئے بنا نہیں اُترتی۔''[۲۸]

دو دو قتل کرنے کے بعد بھی اُس کو سکون نہیں مِلا۔ اُس نے اپنی جنسی ہوس پوری کرنے کے لیے تیسرا قتل بھی کر دیا۔ افسانہ ''کیس ہسٹری'' سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''توبہ توبہ استغفر اللہ کتنا مجبور تھا میں۔۔۔ اُسی کو مار رہا تھا جس کے لیے دو دو قتل۔۔۔ میں نے آخری بار منت کی میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔۔۔ اگر تم۔۔۔ اس نے آخری قوت لگا کر میری شرعی داڑھی پر بڑا سا تھوک دیا اس کے ساتھ ہی اس کی گردن بھی لڑھک گئی۔''۔۔۔ اب وہ میرے سامنے بے بس پڑی تھی۔۔۔ مر کر بھی وہ اِتنی ہی خوبصورت تھی جتنی زندہ۔۔۔ اُس کا جسم ابھی گرم تھا وہ ابھی تر و تازہ تھی اُس کے بدن کا پورا شیش محل سامنے کھلا پڑا تھا جس ایوان کی چاہوں سیر کروں۔۔۔ کوئی مزاحمت کوئی روک ٹوک نہ تھی۔''[۲۹]

اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک ایسے وحشی درندہ صفت انسان کی عکاسی کی ہے، جس نے وحشت پن کی اِنتہا کر دی اور لفظ ''جنس'' کے تصور کو اِتنا بیچ اور گھٹیا بنا دیا کہ اُس لفظ کا اصل مطلب ہی ختم ہو گیا۔

افسانہ حقیقت سے قریب تر ہوتا ہے۔ قید ایک بہت بڑا موضوع ہے۔ حقیقت میں بھی یہی محرکات ہوتے ہیں جو انسان کے اعصاب پر تاثر چھوڑتے ہیں جس سے انسان اپنے حوٰاس کھو بیٹھتا ہے اور انجانے میں ایسے کام کر جاتا ہے جو اسے قیدی بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ نفسیاتی قیدی، ملزم، مجرم قیدی، پاگل قیدی، انسان جس طرح کے بھی مسائل سے دوچار ہوتا ہے اُسی طرح کی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۷۔۲۲۵

۲۔ رضوان احمد، طوفان کی زد پر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۵۹۔۵۸

۳۔ بشیر احمد طاہر، تازہ افسانے، س ن، ص ۴۴

۴۔ منشایاد، تماشا، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۴۷۔۴۳

۵۔ خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۶۳۷۔۶۳۶

۶۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء، ص ۴۴۶

۷۔ امراؤ طارق، تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے، کراچی: حلقہ نیاز و نگار پبلشرز، اشاعت اول، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۷

۸۔ نیلم احمد بشیر، ایک تھی ملکہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۶

۹۔ مجموعہ احمد ندیم قاسمی، ص ۳۰۷

۱۰۔ غلام عباس خان، اس عدالت میں، لاہور: کلاسک پبلشرز، ۱۹۹۲ء، ص ۶۰۔۵۹

۱۱۔ مسعود مفتی، سالگرہ، لاہور: فیروز سنز، بار اوّل، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۱۵۔ سعادت حسن منٹو، پھندنے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۔۱۴

۱۶۔ خدیجہ مستور، تھکے ہارے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۲۔۲۳۰

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، افسانے (خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۳۳۳

۱۸۔ بانو قدسیہ، امر بیل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۱۹۔ شوکت صدیقی، اندھیرا اور اندھیرا، کراچی: الکتاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۹۰

۲۰۔ جمیل عثمان، قیدی، امریکا میں اُردو افسانہ، مرتب: مامون ایمن، فیصل آباد: مثال پبلشرز، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۸۸۷

۲۱۔ طاہرہ اقبال، زمین رنگ، لاہور: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۶۔۲۰۷۔۲۰۶

۲۲۔ مجموعہ خالدہ حسین، ص ۳۳۸

۲۳۔ انور خواجہ، سفید پتھر، امریکا میں اُردو افسانہ، ص ۴۴۸

۲۴۔ بانو قدسیہ، آتشِ زیرپا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۶۲۔۲۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۸۔۲۷

۲۶۔ حسن منظر، ہوا بند کیوں ہے؟، سہ ماہی، لوح، کراچی: جون تا دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۴۳۷

۲۷۔ زمیں رنگ، ص ۲۰۸۔۲۰۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۱۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۱۶